اقبال اور دلِ فطرت شناس

ڈاکٹر سعید احمد

Dr. Saeed Ahmad

Assistant Professor, Department of Urdu,
Govt. College University, Faisalabad.

Abstract:

Iqbal was not only a great philosopher but also a great poet. He showed his great interest and deep insight in modern sciences. One can see a huge number of verses in Iqbal's poetry which are the finest mixture of physics and metaphysics. From East, Iqbal was greatly impressed by Rumi and Ghalib while from West he was impressed by Burgson and Goethe. The scientific consciousness and poetic aesthetics are the chief qualities of his poetry. In this article Iqbal's Urdu poetry is discussed in the light of different sciences.

پیمبرِ خودی اور دانائے راز علامہ محمد اقبال کا کلام مشرق و مغرب کی دانش و فکر کا نقطۂ اتصال ہے۔ مشرقی ادبیات میں اقبال مولانا روم اور غالب جیسے عظیم شعرا سے متاثر نظر آتے ہیں تو مغربی فکر و فلسفے میں برگساں اور گوئٹے جیسے نابغہ روزگار شخصیات سے استفادہ کرتے ہیں۔ اقبال کی شاعری میں تصوف اور عشق و سرمستی کے مضامین مشرقی شعر و ادب کی زندہ روایت کی دین ہیں تو خرد افروزی اور جدید سائنسی شعور مغربی طرزِ احساس کی نمائندہ صفات ہیں۔

اقبال نے ابتدائی تعلیم سیالکوٹ اور لاہور کی درس گاہوں میں حاصل کی جہاں انھیں مولوی میر حسن، میر ابراہیم سیالکوٹی اور شبلی نعمانی جیسے جیّد اساتذہ سے کسبِ فیض کا موقع ملا۔ اقبال نے ان علما سے عربی اور فارسی زبان و ادب کے اسرار و رموز سیکھے۔ بعد ازاں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے اور لندن اور ہائیڈل برگ کی دانش گاہوں سے استفادہ کیا۔ یورپ میں انھیں آرائے نکلسن، سر ٹامس آرنلڈ اور میک ٹیگرٹ جیسے نامور اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ ان اساطینِ علم و ادب کے طفیل اقبال نے نے اپنے دامن کو مغربی علومِ جدیدہ کے صدہا موتیوں سے بھر لیا۔

اقبال خوش قسمت تھے کہ انھیں بیک وقت ''فیضانِ نظر'' اور ''مکتب کی کرامت'' جیسی نعم و

عنایات نصیب ہوئیں۔ان فیوض و برکات کے طفیل اقبال کے کلام میں وہ کمال نظر آتا ہے جو نہ صرف کشتِ دل کو سیراب کرتا ہے بلکہ مزرعِ عقل کی بھی آبیاری کرتا ہے۔اقبال کا یہ لافانی شعر خود ان پر صادق آتا ہے:

تری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو ، عشق حضور و اضطراب

اقبال کے سائنسی شعور کو سمجھنے کے لیے ان کے اردو اور فارسی کلام کے ساتھ ساتھ ان کے انگریزی خطبات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔اقبال کی شاعری کا آغاز فارسی کلام ''اسرار و رموز'' سے ہوتا ہے۔ ''پیامِ مشرق'' اور ''ارمغانِ حجاز'' وغیرہ میں بھی سائنسی اشارات پائے جاتے ہیں۔سائنسی شعور کے حوالے سے ''جاوید نامہ'' کا پایہ بہت بلند ہے۔خصوصاً سیارہ مریخ پر اہلِ مریخ کی علم و حکمت میں ترقی اور شہر مرغدین کا بیان نہ صرف اقبال کے تخیل کا کمال ہے بلکہ اقبال کے سائنسی شعور کا بیّن ثبوت ہے۔

اقبال کا اُردو کلام ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' (کے اردو حصے) پر مشتمل ہے۔ان تمام مجموعہ ہائے کلام میں سائنسی اشارات جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں سائنسی فکر کی تفہیم کے لیے ان کے خطبات "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" کلیدی کردار ادا کرتے ہیں۔ان خطبات میں آئن سٹائن، نیوٹن، برگساں، وائٹ ہیڈ، ڈارون اور اوس پنسکی جیسے فلسفیوں اور سائنس دانوں کے خیالات و نظریات پر بڑی پُر مغز بحثیں ملتی ہیں۔

اقبال علمِ نجوم (Astrology) کو ایک نیم پختہ سائنس Pseudo Science سے زیادہ وقعت نہیں دیتے۔اقبال ایک عالم اور عامل شخص تھے اور توہّم پرستی اور ضعیف الاعتقادی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

توہّم پرست لوگ اپنی تقدیر کو ستاروں کی گردش کے تابع سمجھتے ہیں۔اقبال ''بالِ جبریل'' کی ایک غزل میں کہتے ہیں:

ستارہ کیا مری تقدیر کی خبر دے گا
وہ خود فراخیِ افلاک میں ہے خوار و زبوں(۱)
(ص۳۶۴)

فراخیِ افلاک یا کائنات کی وسعتوں میں ایک ستارے کی مثال ایسے ہی ہے جیسے صحرائے اعظم میں ریت کا ایک ذرہ بلکہ اُس سے بھی کم۔پھر آسمان پر نئے نئے ستارے بنتے رہتے ہیں اور اپنی عمر پوری کر کے ختم ہو جاتے ہیں گویا ستارے بھی تقدیر کے ہاتھوں مجبور ہیں اور وہ بھی موت سے دو چار ہوتے ہیں۔ہمارا سورج بھی ایک ستارہ ہے اور رفتہ رفتہ اپنا ایندھن (یا اپنی مدتِ حیات) مکمل کر کے فنا

کے گھاٹ اتر جائے گا۔ اس لیے سر جیمز جینز نے اسے ''خورشید مرگ پذیر'' (The Dying Sun) قرار دیا ہے۔ گردش تاروں کا مقدر ہے۔ اس حوالے سے میجر امان اللہ اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

> ''یہ شاعر کا سائنسی میدان میں وہ مقام ہے جس سے سائنس دان رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اس عظیم اور وسیع کائنات میں ایک ستارہ اپنے وجود کے اعتبار سے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر زمین کی مثال لی جائے تو یہ سورج کے سامنے اتنی چھوٹی ہے جیسے ایک معمولی ذرہ کسی دہکتے ہوئے تندور کے سامنے ہو۔ اب اس چھوٹے سے ذرے پہ تخلیقات و مخلوقات کا جو سلسلہ ہے وہ بعض اوقات انھی ذرات یا چھوٹے چھوٹے تیرتے ہوئے ٹکڑوں کے اثرات جب اپنی تقدیر پر مرتب کرنا چاہتی ہیں تو اقبال فوراً ان توہمات کی تردید کرتے ہیں اور اپنی شاعرانہ چابک دستی سے انسان کی رہنمائی کرتے ہیں۔
> انسان نے ابھی Big Bang اور اسی طرح کے دوسرے نظریات کی تہ تک جانا ہے۔ کجا یہ کہ یہ راستے میں بیٹھ کر ستاروں میں اپنی منزل تلاش کرے اور ایسے راستے پہ چل نکلے جہاں اس کا نشان بھی نہ ملے۔''(۲)

نہ ہے ستارے کی گردش نہ بازیِ افلاک
خودی کی موت ہے تیرا زوالِ نعمت و جاہ
(ص ۳۷۸)

اقبال کی شاعری میں ستاروں کا ذکر شاعرانہ، فلسفیانہ اور سائنسی نقطۂ نظر سے ملتا ہے۔ شاعرانہ سطح پر نادر تشبیہات اور تراکیب کی صورت میں فلسفیانہ سطح پر ہمارے توہّمات اور عقائد پر طعن و تعریض اور سائنسی نقطۂ نظر سے ستاروں کی حیات و ممات اور گردش وغیرہ سے متعلق بہت خوب صورت اشعار ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''اُمید'' کا یہ خوب صورت شعر ملاحظہ کیجیے:

غمیں نہ ہو کہ بہت دور ہیں ابھی باقی
نئے ستاروں سے خالی نہیں سپہرِ کبود
(ص ۶۲۲)

''ضربِ کلیم'' ہی میں شامل نظم ''سرودِ حلال'' کا یہ فکر انگیز شعر ملاحظہ کیجیے:

ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجود
(ص ۶۳۶)

مذہبی نقطۂ نظر سے وہ نوائے پنہاں، صدائے کن فیکون ہے تو سائنسی زاویۂ نگاہ سے اسے انشقاقِ عظیم یا بڑا دھماکہ کہہ سکتے ہیں۔ اُس عظیم دھماکے (Big Bang) سے جو گرمی پیدا ہوئی اس کا تصور کرنا محال ہی نہیں ناممکن ہے۔ اس مہیب دھماکے سے تمام مادّہ کائنات میں پھیل گیا اور اَن گنت ستارے معرضِ وجود میں آ گئے۔ لاکھوں اربوں ستارے مختلف کہکشاؤں کی صورت میں بیکراں خلا میں گردش کرنے لگے۔ ایڈون ہبل کے نظریۂ توسیعِ کائنات کے مطابق کہکشائیں آج بھی ایک دوسرے سے دُور بھاگ رہی ہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری اپنی کتاب ''اسلام اور جدید سائنس'' میں عظیم دھماکے کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''عظیم دھماکے (Big Bang) سے رو پذیر ہونے والے عملِ انشقاق (پھٹنے کے عمل) کے آغاز کے ساتھ ہی ایک سیکنڈ کے سوویں حصے (Hundredth Part) میں وہ 'اکائیت' پھیل کر ابتدائی آگ کا گولا (Primordial Fiber Ball) بن گئی اور دھماکے کے فوراً بعد اس کا درجہ حرارت ایک کھرب سے ایک کھرب ۸۰/ارب سینٹی گریڈ کے درمیان جا پہنچا۔ تاہم عظیم دھماکے سے ایک منٹ بعد ہی کائنات کا درجہ حرارت تیزی سے گرتے ہوئے دس گنا کم ہو کر ۱۰/ارب سے ۱۹/ارب سینٹی گریڈ کے درمیان آن پہنچا۔ یہ سورج کے مرکز کے موجودہ درجہ حرارت سے تقریباً ایک ہزار گنا زیادہ حرارت تھی۔ اُس وقت کائنات زیادہ تر فوٹان، الیکٹران، نیوٹریناس اور اس کے مخالف ذرّات کے ساتھ ساتھ کسی حد تک پروٹان اور نیوٹران پر مشتمل تھی۔''(۳)

کائنات کے اُس اوّلین مرحلے کی تصویر کشی سب سے پہلے جارج گیمو (George Gamow) نامی سائنس دان نے ۱۹۴۸ء میں تصنیف کردہ اپنی مشہور تحریر میں پیش کی۔ جارج گیمو اپنی کتاب (Biography of the Earth) میں لکھتے ہیں:

> ''ہیئت دان بتاتے ہیں کہ ہمیں آسمان پر جتنے ستارے نظر آتے ہیں جن میں ہمارا سورج بھی ایک ہے۔ ہمیشہ سے قائم نہیں ہیں بلکہ اب سے تقریباً بیس کھرب سال پہلے اُس آتشیں گیس سے بنے جو اس وقت ساری کائنات میں جاری و ساری تھی۔''(۴)

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہماری زمین پہلے سورج ہی کا ایک حصہ تھی۔ سورج سے علاحدہ ہو کر اور آسمانوں سے پانی کے نازل ہونے کے باعث یہ رفتہ رفتہ ٹھنڈی ہو گئی۔ زمین کی بیرونی پرت ٹھنڈی اور ٹھوس ہو گئی۔ اقبال کے خیال میں زمین کے ذرّات اور سورج میں ایک خاص تعلق ہے۔ ''بانگِ درا'' کا شعر ہے:

حقیقت ایک ہے ہر شے کی ، خاکی ہو کہ ناری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
(ص ۳۰۲)

خالد عرفان اس شعر کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''نظم ''طلوعِ اسلام'' کے اس شعر میں سائنس کی دنیا کا ایک اہم ترین باب مضمر ہے۔ مادے کی ساخت میں آپ جانتے ہیں کہ جدید نظریات تک پہنچنے کے لیے کتنے مرحلوں سے گزرنا پڑا۔ مادے کی مفرد اکائی عنصر ہوتی ہے اور عنصر چاہے اس کی شکل ٹھوس شے کی ہو کہ مائع کی یا گیس کی، اس کے اقل ترین غیر منقسم حصے ہوتے ہیں خود اس کے جوہر، اور یہ کہ ہر عنصر کے جوہروں میں عنصر ہی کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ پھر پتہ چلا کہ غیر منقسم جوہر بھی تقسیم ہوسکتا ہے۔ کسی عنصر کے جوہر تقسیم کیے جائیں تو ان کی اینٹیں ہوتی ہیں۔ الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران۔ بس ان کی مختلف تعداد مخصوص ترتیب سے علیحدہ علیحدہ عنصر بنتے ہیں۔ اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دنیا میں جتنی بھی مفرد اشیا پائی جاتی ہیں ان سب کے جوہر بنتے ہیں ایک ہی طرح کی اکائی سے یعنی حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو۔ عناصر کے جوہروں کی اندرونی ترکیب میں پائے جانے والے ذرّات کی ایک صفت ان پر موجود برقی قوت ہوتی ہے۔ الیکٹران منفی برق کے حامل ہوتے ہیں اور پروٹان مثبت برق کے اور چونکہ جوہر پر کوئی برق نہیں پائی جاتی اس لیے مثبت پروٹان اور منفی الیکٹران کی تعداد ہر جوہر میں یکساں ہوتی ہے البتہ نیوٹران کی تعداد میں فرق ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ پروٹان کے مقابلہ میں الیکٹران نہایت ہی ہلکے ہوتے ہیں اس لیے بھاری پروٹان ہلکے الیکٹران کو اپنی طرف کشش کرنے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر دونوں ٹکرا جائیں تو جوہر ختم ہو جائے گا۔ چونکہ جوہر مستقل رہتا ہے پتہ چلایا گیا کہ اس کشش کا مداوا جوہر کے مرکزیہ کے گرد منفی الیکٹرون کے تیزی کے ساتھ خاص خاص مداروں میں لگاتار گھومتے رہنے سے ہو جاتا ہے۔ مرکزیہ میں پروٹان اور نیوٹران جمع رہتے ہیں۔ یہ سارا انظام شمسی کی طرح ہوتا ہے جس میں سیارے سورج کے گرد اپنے اپنے مداروں میں گھومتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں ٹکراتے۔ جوہر کے اس اندرونی نظم کی وجہ سے عنصر نہ صرف قائم رہتے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے ترکیب بھی پا سکتے ہیں۔''(۵)

اقبال کی شاعری میں کائناتی شعور کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اقبال کا تصورِ کائنات تدبر قرآن اور فلسفہ و سائنس کے جدید نظریات پر گہری نظر رکھنے کے باعث بہت جاندار اور فکر انگیز ہے۔ اگرچہ ''بانگِ درا'' میں بھی اقبال کے کائناتی شعور کی چند مثالیں مل جاتی ہیں لیکن ''بالِ جبریل'' کے منظومات اور غزلیات میں متعدد اشعار ان کے زبردست تفکر کی غمازی کرتے ہیں۔ ''بالِ جبریل'' کی چودھویں غزل ملاحظہ کیجیے:

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں
بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم
اِک رِدائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں
کہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں
تھی کس درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں
(ص۳۵۵)

اقبال کے تصورِ کائنات کو سمجھنے کے لیے چند جدید نظریات سے آگاہی از بس ضروری ہے۔ کائنات کی بے کرانی اور ہر لمحہ وسعت پذیری کے متعلق اقبال نے جا بجا اظہارِ خیال کیا ہے۔ ''بالِ جبریل'' کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

وہ حرفِ راز کہ مجھ کو سکھا گیا ہے جنوں
خدا مجھے نفسِ جبرئیل دے تو کہوں
سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ ؐ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں
یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کُن فیکوں
(ص ۳۶۴)

''بالِ جبریل'' کی دو اور غزلیات میں بھی ''عروجِ آدمِ خاکی'' کی ترکیب استعمال ہوئی ہے:

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے
(ص ۳۵۰)

عروجِ آدمِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں ، یہ ستارے ، یہ نیلگوں افلاک
(ص ۳۹۴)

اقبال عظمتِ آدم کا نقیب ہے۔ وہ انسان کو تقدیر کا پابند نہیں سمجھتا۔ انسان اپنی خودی کو بلند کر کے فطرت کا راز دار بن سکتا ہے۔ اقبال نے بارہا آدمِ خاکی کے عروج کا نعرہ لگایا ہے۔ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ انسانیت کی معراج ہے۔ ڈاکٹر یوسف حسین خان اپنی کتاب ''روحِ اقبال'' میں معراجِ نبوی ﷺ کے متعلق رقم طراز ہیں:

''اسلام کی تمدنی اور تخیلی تاریخ میں معراج کے واقعے کو ہمیشہ سے خاص اہمیت رہی ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جذباتی اور نفسیاتی مزاج کا اس واقعے سے گہرا تعلق ہے۔ اسلام کے تصورِ کائنات میں معراج کے واقعات اچھی طرح سے کھپتے ہیں۔ معراج زمان و مکاں کی حقیقت اور اس کی مکمل تسخیر کی آئینہ دار ہے۔ جب انسانی روح فعلیتِ مطلقہ سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو ''زمان و مکاں'' کی حقیقت اپنے سارے راز اس پر کھول دیتی ہے۔

معراج میں آنحضرت ﷺ نے بغیر کسی قسم کے مادی وسائل کی مدد کے ایک لمحے کے اندر ''مسجدِ حرام'' سے ''مسجدِ اقصیٰ'' اور پھر ''سدرۃ المنتہیٰ'' تک کی سیر فرمائی۔ اس روحانی سیاحت میں معلوم ہوتا ہے کہ تمام حاوی قوانین شروع سے آخر تک معطل رہے۔ آپ ﷺ رُوح الامین کے ہمراہ برّاق پر سوار ہو کر جو بجلی سے زیادہ تیز اور روشنی سے زیادہ سبک خرام تھا، آسمان پر تشریف لے گئے۔ وہاں متعدد پیغمبروں سے ملاقات ہوئی اور آپ نے سماوی آیات کا مشاہدہ فرمایا۔ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچے تو ذات واجب تعالیٰ سے قرب خاص حاصل ہوا جس کی نسبت سورۂ نجم میں اس طرح ذکر ہے:

وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى

(اور وہ تھا اونچے کنارہ پر آسمان کے پھر قریب آیا اور جھکا۔ پھر رہ گیا فرق دو

کمان کے برابر یا اس سے بھی کم)

اس موقع پر جو راز و نیاز کی گفتگو رہی اس کی طرف **فَاَوحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی** (پھر اس نے اپنے بندے کو وحی کی جو کچھ کہ وحی کی) میں اشارہ کیا گیا ہے۔ روایتوں میں مذکور ہے کہ معراج کے تمام واقعات اتنے وقفے میں ختم ہو گئے کہ شاہِ کونین ﷺ کی واپسی پر دروازے کی زنجیر بدستور ہل رہی تھی اور آپ کے بستر کی گرمی ابھی تک باقی تھی۔ غرض وجوب و امکان اور کون و مکان کے تمام عقدے طرفۃ العین میں حل ہو گئے اور آپ نے کائنات کے معانی و حقائق کا مختلف اشکال و صور میں اس طور مشاہدہ فرمایا کہ اس سے بڑھ کر مشاہدہ کرنا ممکن نہیں۔ اقبال نے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ معراج کا مسئلہ دراصل ''زمان و مکان'' کی گتھی کا حل اور فطرت کے مقابلے میں انسانی نفس کی آزادی کا مؤثر ادعا ہے جو پیغمبرِ اسلام نے اپنی وجدانی قوت سے دنیا کے سامنے پیش فرمایا:

از شعور است ایں کہ گوئی نزد و دور
چیست معراج ؟ انقلاب اندر شعور

.....

انقلاب اندر شعور از جذب و شوق
وار ہاند جذب و شوق از تحت و فوق

.....

ایں بدن یا جانِ ما انباز نیست
مشت خاکے مانعِ پرواز نیست

اگر انسانی شعور میں انقلاب ہو جائے تو زماں مکاں (ٹائم اسپیس) کی حقیقت کی پیمائش کا پیمانہ اور معیار انسانی خودی ٹھہرتی ہے۔ حقیقت ''زماں مکاں'' کا انحصار ان حوادث و تغیرات پر ہوتا ہے جو انسانِ کامل کی زندگی میں باطنی طور پر وجود پذیر ہوتے ہیں۔ یہ باطنی تجربہ علم کا اصلی ماخذ بن جاتا ہے لیکن یہ علم محض تخیلی اور استدلالی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ وجدانی ہوتا ہے جس کے بغیر حیات، کائنات اور ''زماں و مکاں'' کی حقیقت کا پتا نہیں چل سکتا۔ قرآن پاک میں اس علم کی مؤثر قوت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

یٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوا لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ

(اے جنوں اور انسانوں کے گروہ اگر تم سے ہو سکے تو آسمانوں اور زمین کے
کناروں کے پرے نکل جاؤ، لیکن تم نہیں نکل سکتے بغیر قوت کے)

علم کی قوت سے انسانی ذہن عالم کے پرے جا سکتا ہے اور اس پر تصرف حاصل کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ علم حقیقی علم ہو۔ محسوس ''زماں و مکاں'' کی معروضی تحدید سے روح آزاد ہونا چاہتی ہے۔ محدود ہونا روحانی آزادی کی راہ میں سنگ راہ ہوتا ہے جس کو وہ اپنی دائمی حرکت سے ہٹا دینا چاہتی ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں روح رومیؒ اقبال کو **الاسلطان** کے معنی کی تشریح کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ انسان کامل اپنے علم کی قوت سے جہان چار سو پر متصرف ہو جاتا ہے اور افلاک تک کی گرفت میں آ جاتے ہیں:

باز گفتم پیش حق رفتن چناں؟
کوہِ خاک و آب را کفتن چناں؟

.....

آمر و خالق بروں از امر و خلق
مازشتِ روزگاراں خستہ حلق

.....

گفتہ اگر سلطاں ترا آید بدست
می تواں افلاک را از ہم شکست

.....

باش تا عریاں شود ایں کائنات
شوید از دامانِ خود گردِ جہات

.....

دَر وجودِ اُو نہ کم بینی نہ بیش
خویش را بینی از و اُور از خویش

.....

نکتۂ ''اِلّا بسلطان'' یاد گیر
ورنہ چوں مور و مَلَخ درگلِ بمیر(۶)

اقبال واقعۂ معراج سے یہ نکتہ اخذ کرتے ہیں کہ انسان حکمت اور دانائی کے طفیل تسخیر کائنات کی صلاحیت رکھتا ہے۔ صاحب المنجد نے لفظ ''سلطان'' کے معانی قوت، حکمت اور تدبیر کے بتائے

ہیں۔ جبکہ ''بائبل، قرآن اور سائنس'' کے مصنف موریس بوکائلے مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ ''نَفَذَ'' کے معانی ''آر پار ہو جانا'' کے بتاتے ہیں:

> "To Penetrate' is the translation of the verb nafada followed by the preposition min. According to Kazminski's dictionary, the phrase means 'to pass right through and come out on the other side of a body (e.g. an arrow that comes out on the other side)"(7)

کیا اس خدنگِ جستہ کا اطلاق آج کی راکٹ اور میزائل ٹیکنالوجی پہ نہیں ہوتا؟ ''بالِ جبریل'' سے چند مزید اشعار پیشِ خدمت ہیں:

دے ولولۂ شوق جسے لذتِ پرواز
کر سکتا ہے وہ ذرہ و مہر کو تاراج
ناوک ہے مسلماں! ہدف اس کا ثریّا
ہے سرِّ سرا پردۂ جاں نکتۂ معراج
تو معنیٔ و النّجم نہ سمجھا تو عجب کیا
ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج
(ص۵۲۹)

طلسم گنبدِ گردوں کا توڑ سکتے ہیں
زجاج کی یہ عمارت ہے سنگِ خارہ نہیں
یہیں بہشت بھی ہے حور و جبرئیل بھی ہے
تری نگہ میں ابھی شوخیِ نظارہ نہیں
(ص۳۷۲)

تو اے اسیرِ مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں
(ص۳۸۰)

اِک شرعِ مسلمانی ، اک جذبِ مسلمانی
ہے جذبِ مسلمانی سرِ فلک الافلاک
(ص۳۷۴)

معراجِ نبوی ﷺ ایک عظیم معجزہ ہے۔ معجزہ کے لغوی معانی ہی یہ ہیں ''وہ مقام جہاں عقل عاجز آ جائے''، یعنی معجزہ کی تشریح و تعبیر طبیعیات کے اصولوں کی روشنی میں نہیں کی جا سکتی۔ اگرچہ واقعۂ معراج واقعی محیر العقول معجزہ ہے اور اسے سائنس سے ثابت نہیں کیا جا سکتا لیکن ہمارے علمائے دین اور مذہبی اسکالرز اس واقعہ کی تشریح و تعبیر میں فلسفیانہ اور سائنسی طرزِ فکر سے بھی استفادہ کرتے ہیں۔ علامہ طاہر القادری معجزۂ معراج کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''معجزۂ معراج طیِ زمانی و مکانی دونوں کا جامع ہے۔ اس کا صدور نظریۂ اضافت میں ملنے والے وقت کا ٹھہراؤ کی ممکنہ صورت کے برعکس ہوا۔ نظریۂ اضافت کے مطابق روشنی کے قریب قریب رفتار سے بھاگنے والے مادی جسم پر وقت کرۂ ارضی پر معمول کی زندگی کی نسبت انتہائی تیزی سے گزر جاتا ہے۔ آئن سٹائن کی دو جڑواں بھائیوں والی مثال میں روشنی کی نصف رفتار سے محوِ سفر خلاباز پر زمینی دس سال دگنی رفتار سے گزرے جس کی وجہ سے خلاباز کی عمر میں صرف پانچ سال کا اضافہ ہوا جبکہ اس کا زمینی بھائی اپنی دس سال عمر گزار چکا تھا۔ گویا وہ خلاباز بھائی سے پانچ سال بڑا ہو چکا تھا۔ نظریۂ حیات اور مکان و زمان کے نئے نظریات کے مطابق ہم نے دیکھا کہ روشنی کے قریب رفتار سے سفر کرنے پر وقت زیادہ تیزی سے گزر جاتا ہے اور ایسا سفر کرنے والا مادی جسم وقت کی دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے جبکہ معراج کے دوران تاجدارِ کائنات ﷺ نے وقت کو پچھاڑ دیا۔ عام روشنی سے ہزاروں گنا تیز رفتار سے سفر کرنے پر بھی آپ ﷺ وقت کی رو میں پیچھے رہ جانے کی بجائے آگے نکل گئے یہی آپ ﷺ کا معجزہ ہے کہ عام سائنسی، عقلی قوانین کے برخلاف نہ صرف روشنی سے زیادہ رفتار حاصل کر لی بلکہ صحیح سلامت سفر کے بعد وقت کے اُسی لمحے میں واپس بھی تشریف لے آئے۔ یہ اللہ رب العزت کی قدرت کاملہ کا اظہار تھا جس کی بدولت آپ سے یہ معجزہ صادر ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس فعل کی نسبت بھی اپنی ہی طرف کی اور فرمایا:
>
> **سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلاً**
>
> وہ ذات (ہر نقص اور کمزوری سے) پاک ہے جو رات کے تھوڑے سے حصے میں اپنے (محبوب اور مقرب) بندے کو لے گئی۔
>
> سفرِ معراج میں اس محیر العقول رفتار سے روانگی کا راز عقلِ انسانی میں نہیں سما سکتا۔ یہ اللہ رب العزت کی قدرتِ کاملہ ہی کا ظہور تھا جس کی بدولت ایسا ممکن ہوا۔

مکان۔ زمان (Space-Time) کے نظریے میں وقت کی اضافیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ مختلف افراد یا مختلف مکان پر وقت کا مختلف رفتار سے گزرنا باقاعدہ ایک علمی حیثیت میں تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اضافیتِ زمان پر اللہ رب العزت کی آخری و حتمی وحی میں بہت سی آیات موجود ہیں۔ طیِ زمانی و مکانی کے ضمن میں آنے والی اَمثلہ کا تعلق بھی اضافیتِ زماں ہی سے ہے۔۔۔ وقت اور اس کے گزرنے کی رفتار کی حیثیت محض ہمارے ادراک تک محدود ہے۔ ہمارا ادراک ہی وقت کی تعریف کرتا ہے اور یہی اُس کی رفتار کو تیز یا آہستہ قرار دیتا ہے۔ دراصل وقت محض ایک ایسا ادراک ہے جس کا انحصار واقعات کی ترکیب پر ہوتا ہے اور واقعات کی ترتیب ہی وقت کے ایک سلسلے کا باعث بنتی ہے۔''(۸)

اقبال نے وقت کے تصور پر اپنے خطبات اور اردو فارسی کلام میں جا بجا اظہارِ خیال کیا ہے۔ اگرچہ اقبال کا تصورِ زماں بڑا نازک، پیچیدہ اور غور طلب تصور ہے لیکن اقبال نے اپنے متعدد اشعار میں اسے آسان فہم انداز میں بھی پیش کیا ہے۔ مثلاً اقبال کا یہ مشہور شعر دیکھیے:

مہینے وصل کے گھڑیوں کی صورت اُڑتے جاتے ہیں
مگر گھڑیاں جدائی کی گزرتی ہیں مہینوں میں
(ص ۱۲۹)

اس شعر میں یہ مسئلہ بطور مثال بیان کیا گیا ہے کہ وقت ہمارے ذہن کا خود ساختہ ادراک ہے۔ ہمارا نفس و ذہن مطمئن ہو تو وقت کی رو تیز معلوم ہوتی ہے اور اگر مضطرب ہو تو وقت بہت آہستہ خرام محسوس ہوتا ہے۔ وصل کا وقت تیزی سے گزر جاتا ہے اور فراق کی گھڑیاں ٹھہر جاتی ہیں۔ یہ ایک عام فہم مثال ہے اور ہر فرد اس کا تجربہ رکھتا ہے۔

اس شعر سے ملتا جلتا لطیفہ آئن سٹائن کی وہ مثال ہے جو انھوں نے ایک نوجوان لڑکی کے اس سوال کے جواب میں پیش کی تھی کہ آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کیا ہے؟ آئن سٹائن نے جواب دیا کہ فرض کرو کہ تمھارے محبوب نے تم سے کسی مقام (یا ہوٹل) میں ملنے کا وقت مقرر کر رکھا ہے تب تمھیں انتظار کی چند گھڑیاں پھیل کر دنوں میں بدلتی محسوس ہوں گی اور جب تمھارا محبوب آ کر تم سے گھنٹوں باتیں کرتا رہے تو تمھیں یوں محسوس ہوگا کہ وہ طویل وقت چند لمحوں میں گزر گیا ہے۔ اقبال زمانے کو زنجیرِ ایام سے تعبیر کرتے ہیں:

زمانہ کہ زنجیرِ ایام ہے
دَموں کے اُلٹ پھیر کا نام ہے
(ص ۴۵۵)

اقبال کا خیال ہے کہ ہماری عقل زمان و مکاں کی پابند ہے۔ چونکہ عقل حقیقت تک رسائی کے لیے حواس کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور حواس کی قوت محدود ہوتی ہے اس لیے ہم حقیقتِ مطلق کا کلی ادراک کرنے سے قاصر رہتے ہیں:

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زُنّاری

غلام صابر نے اپنی کتاب "Iqbal-Religion and Physics of the New Age" میں پال ڈیویز کا ایک قول نقل کیا ہے، فرماتے ہیں:

"Real time is external, as unanimously expressed by most of the scientists and philosophers. It has nothing to do with serial time or, so to speak, clock time. Following is a beautiful quotation from the "Mind of God" of Paul Davis:

"Time and Eternity: the fundamental paradox of existance'

"Eternity is time

Tiem, Eternity

To me the two as opposites

is Man's perversity"(9)

وقت کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کر کے دیکھنا دراصل ہمارے محدود ناقص اور نارسا عقل وفہم اور حواس کے سبب ہے۔ انسانی عقل کے لیے زمانِ تسلسل کا تصور کچھ ذرا مشکل ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ حرم زئی اپنی تصنیف ''دامِ شعور'' (۱۰) میں اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اقبال کے نزدیک ذاتِ باری تعالیٰ کا آنِ واحد ایک ابدی لمحۂ موجود ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ہمدانی کے کائنات کے غیب وحضور کے نظریے کا بھی ذکر کیا ہے۔

اقبال کی شاعری میں انعکاسِ نور، انعطافِ نور، طیف اور سراب جیسے مظاہر کا ذکر متعدد مقامات پر ہوا ہے۔ اقبال کی شاعری میں رنگ ونور کے بیشتر اشعار فلسفے اور سائنس کا حسین امتزاج معلوم ہوتے ہیں۔ نظم ''فاطمہ بنتِ عبداللہ'' کا ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

تازہ انجم کا فضائے آسماں میں ہے ظہور
دیدۂ انساں سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور
(ص ۲۴۴)

یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ ستارے اپنی عمر پوری کر کے فنا ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے ستارے جنم لیتے ہیں۔ بعض ستارے ہم سے ہزاروں نوری سال کے فاصلے پر واقع ہیں اور ان کی شعاعیں ابھی تک روئے زمین تک نہیں پہنچیں۔ ہم جن ستاروں کو آسمان میں فروزاں اور رخشندہ دیکھتے ہیں وہ ان کے ماضی بعید کی صورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جب ایک ستارے کی موجِ نور ہم تک پہنچے تب تک وہ ستارہ جل کر خاکستر ہو چکا ہو۔

اقبال نے جہاں اہلِ مغرب کی صنعت و حرفت اور سائنس میں ترقی کی تعریف کی ہے وہاں سائنس اور ٹیکنالوجی کے معاشرے پر منفی اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ آج مغربی تہذیب جس احساسِ مغائرت اور روحانی اضطراب کا شکار ہے اس کی ایک وجہ سائنس کی طاقت کے غلط استعمال اور ٹیکنالوجی کے ثمرات کے باعث معاشرتی قدروں کے انحطاط پذیر ہونے کا المیہ بھی ہے۔ سائنسی معاشرے میں انسانی سوچ اور خیالات تبدیل ہو جاتے ہیں اور روحانیت کے سوتے خشک اور خاموش ہو جاتے ہیں۔ مذہب اور فلسفے کی گرفت کمزور پڑنے سے اخلاقی اور معاشرتی قدریں بھی شکستہ ہونے لگتی ہیں۔ معاشرے پر سائنس کے اثرات کے ضمن میں برٹرینڈ رسل کی کتاب بھی ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ برٹرینڈ رسل کو ''پیغمبرِ سائنس'' بھی کہا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی اپنے خطبات میں رسل کا ذکر کیا ہے۔

اقبال سمجھتے ہیں کہ سائنس اور اس کی اطلاقی صورت ٹیکنالوجی انسان کے تمام دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتی۔ اس تیز رفتار مشینی زندگی نے انسان کو بھی ایک روبوٹ بنا کر رکھ دیا ہے جو احساسِ مروّت سے عاری ہوتا ہے۔ چنانچہ ''بالِ جبریل'' میں فرماتے ہیں:

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت
احساسِ مروّت کو کُچل دیتے ہیں آلات
(ص۴۳۵)

اور ''ضربِ کلیم'' میں رقم طراز ہیں:

تاریک ہے افرنگ مشینوں کے دھویں سے
یہ وادیِ ایمن نہیں شایانِ تجلّی
(ص۶۵۱)

اقبال کے سائنسی شعور میں فلسفے اور مذہب کے عناصر بھی کارفرما نظر آتے ہیں۔ اقبال کے تصورِ زمان و مکاں، تصورِ ارتقا اور دیگر تصورات و نظریات پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اقبال مشاہیرِ مشرق و مغرب کے فلسفیانہ افکار سے بخوبی آگاہ تھے۔ انھوں نے معاصر منظر نامے کو بھی عمیق نگاہی سے دیکھا اور ذاتی فکر و ریاضت سے بھی کام لیا۔ اقبال کا سائنسی شعور وقت کے ساتھ ساتھ پختہ ہوتا گیا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ''ہمالہ'' جیسی نظموں سے لے کر ''مسجدِ قرطبہ'' اور پھر ''بانگِ درا'' سے ''بالِ جبریل'' تک

ایک مسلسل ارتقاوارتفاع نظر آتا ہے۔اقبال نے طبیعیات سے مابعدالطبیعیات تک کا سفر بڑی خوش اسلوبی سے طے کیا ہے۔اردو شعرا کے سائنسی شعور کے سلسلہ میں اقبال کا نام نہایت بلند درجہ کا حامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ محمد اقبال، کلیاتِ اقبال، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع نہم، ۲۰۰۹ء

۲۔ امان اللہ خان، میجر، اقبال اور کائنات، مشمولہ: ماہِ نو (مدیر: صفدر بلوچ) لاہور: جلد ۵۸، شمارہ ۱۱، نومبر ۲۰۰۵ء، ص:۹

۳۔ طاہر القادری، علامہ، اسلام اور جدید سائنس، لاہور: منہاج القرآن پبلی کیشنز، اشاعت ہشتم، ۲۰۱۰ء، ص:۲۱۔۳۲۰

۴۔ جارج گیمور، زمین کی سرگزشت، (مترجمہ: سید علی ناصر زیدی)، لاہور: کلاسیک، ۱۹۶۳ء، ص:۱۱

۵۔ خالد عرفان، سائنسی انکشافات اور اقبال کی پیش بینی، مضمون مشمولہ: بادبان، سہ ماہی، (مدیر: ناصر بغدادی)، کراچی، جولائی تا دسمبر ۲۰۰۵ء، شمارہ نمبر ۱۰، ص:۳۸۹

۶۔ یوسف حسین خان، روحِ اقبال، نئی دہلی: مکتبہ جامعہ، طبع پنجم، ۱۹۶۲ء، ص:۹۸۔۳۹۵

7. Bucaille, Maurice, The Bible the Qur'an and Science, Lahore: Progressive Books, 2005, P-168

۸۔ طاہر القادری، علامہ، اسلام اور جدید سائنس، ص:۹۷۔۳۷۷

9. Sabir, Ghulam, Iqbal Religion and Physics of the New Age,

۱۰۔ عبداللہ حرم زئی، ڈاکٹر، دامِ شعور __ سائے سراب التباس، لاہور: سٹی بک پوائنٹ، ۲۰۱۲ء، ص:۴۰

☆.....☆.....☆